مثنویاتِ اقبال

(اسرار و رموز)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

مالک رام

مترجم کا نوٹ: جن لوگوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا دیباچہ دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) جو علیحدہ کتابی صورت میں بھی بعنوان محاسن کلام غالب چھپ چکا ہے، پڑھا ہے، وہ اس سے موصوف کے عمق فکر اور پہنچائی خیال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علم و ادب اُردو کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ بدقسمتی سے اجل نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ کچھ مستقل خدمت زبان کر سکتے۔ اُنھوں نے سوائے چند مضامین کے کوئی اپنی زیادہ پائیدار یادگار نہیں چھوڑی، مگر جو تھوڑا بہت بھی ان کے قلم سے نکلا ہے، کافی ہے ہم اس سے اُن کے وسعت مطالعہ، وقت نظر اور اصابت رائے کی نسبت ایک صحیح رائے قائم کر سکیں۔

ایک برخود غلط ادیب کی رائے میں دیباچہ مذکور میں ''سوائے شرح اشعار کے اور جو کچھ ہے، سب واہی تباہی ہے۔'' یہ رائے اُردو کے ایک شاہکار مضمون کی نسبت ہے اور ہر شخص کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی نسبت جو رائے چاہے قائم کرے۔ مگر کیا اچھا ہو کہ تنقید اور رائے قائم کرنے سے پہلے جذبہ تنقیص و تفضیح دل سے نکال دیا جائے۔ پندار اور تفاخر کوئی اچھی چیز نہیں، اور جب کسی نقاد کے دل میں یہ چیزیں راہ پکڑ لیں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور رواروی میں ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے جو کسی دوسری حالت میں غالباً وہ زبان پر نہ لائے گا۔

اگر ادیب ممدوح نے ذرا یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ مضمون لکھتے وقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی، تو شاید وہ اس فیصلے پر نہ پہنچتے۔ میرے نزدیک اس مضمون میں جو والہانہ جوش دکھایا گیا ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل، غالب سے پہلے اُردو زبان کا جو سرمایہ تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ ایسا پامال اور فرسودہ مضمون ہو چکا ہے کہ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمیں بتایا کہ

اُردو زبان میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے، اس میں وسعت کی کتنی گنجائش ہے، اور اس میں کیسے کیسے خیالات جدید اور مضامین عالیہ کا اظہار ممکن ہے۔ بجنوری مرحوم کے پیش نظر غالب بھی تھا اور اس کے پیشرو معاصرین بھی۔ انھیں حیرت ہوئی کہ اس آذر کدے میں یہ ابراہیم کیونکر ہوا؟ جواب ایک ہی تھا۔ جوہر صالح اور ذہانت خدا داد۔ اس امر نے ان کے دل پر غالب کے تفوق کو منقوش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی قدرتی طور پر خوش اعتقادی کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مضمون میں مرحوم نے آئینہ غالب میں میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اپنا تخیل اتنا بلند اور علم اتنا وسیع تھا کہ لکھ تو وہ رہے تھے دیوان غالب پر تبصرہ لیکن جا بجا اپنی رُوح اور دماغ کے نقوش کی تعبیر دیوان غالب سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے مرغوبات کو غالب پر چسپاں کر دیا۔ لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون زیر بحث میں ایسے مبحث بھی آ گئے ہیں، جو نفس مضمون سے بے تعلق سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ واہی تباہی ہے۔ یقیناً اس میں بھی اتنا سامان بصیرت موجود ہے، کہ ہم اس سے غالب کی دھندلی تصویروں کو زیادہ اُجاگر کر سکتے ہیں اور غیر ممالک کے مصنفین کے ساتھ موازنہ کر کے ایک رائے (خواہ وہ کتنی ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو) قائم کر سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون بھی ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی سب سے اوّل بار ۱۹۱۶ء میں اور رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ مرحوم نے جب ہی یہ مضمون انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں لکھا تھا۔ جب ایک ہی زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کیے جائیں تو وہ اپنی شگفتگی اور چستی کا اکثر حصہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے، میں نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا ہے مگر کہیں بھی اصل مضمون کی رُوح کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ نوٹ سارے کے سارے میں نے خود بڑھائے ہیں، اور کوشش کی ہے کہ متعلقہ اشعار درج کر دیے جائیں۔ لیکن پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مضمون پر کے تمام اشعار دے دیئے گئے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ایک موضوع پر طرح طرح سے بحث کی گئی ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ اشعار درج کرتا تو بلا مبالغہ دونوں مثنویاں ساتھ چھپ جاتیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناظرین اسرار و رموز کا خود غائر مطالعہ کریں اور اُن کے مضامین کو سمجھنے کی سعی کریں۔ فقط،
مالک رام

جب نقد و تبصرہ کا موضوع کوئی زندہ مصنف ہو تو نقاد کے لیے لازم ہے کہ قدم پھونک پھونک کر اُٹھایے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ مصنف اور نقاد کے درمیان کوئی رنگین پردہ حائل ہو جائے گا، یا قرب مکانی ہی

مصنف کے خط و خال کی تفاصیل کو دھندلا کر دے۔

ہندوستان کے اسلامی ادب میں رُوح ملائے اعلیٰ کی جانب صعود میرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ایک مقدس اقالیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا ہے، جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے۔ مگر وہ کوئی غیر معقول مشکک نہیں تھا، جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی، جس نے دُنیا میں آگ سی لگا دیں۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہو سکی اور اس کی ایک نگاہ نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔

حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی، دیکھا کہ دُنیا اپنے ظاہری حسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا، مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے اُستاد کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دُنیا کی تعمیر ٹھانی، اور اسے اپنے سینہ میں نشو و نما دی۔ اُمید کی جھلک نے اسے نئی زندگی دی اور یوں تن مردہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

اقبال کی شاعری اب یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے، اور نئی عمارت کو متفاوٗلی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدہ و بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانہ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے، جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے، جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے۔ اس کی رُوحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے، جو اس مادّی دور کی پیداوار ہے۔ اقبال اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزل مقصود حرم محترم ہے۔

اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور خود ہی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی) سے پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے جس کے لیے ہماری نئی نسل پُرانے غزل گو شعراء کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے، جس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے ہیں۔ زمانہ پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہو گی، جو زمانہ حاضرہ کی ان دونوں معرکہ آراء نظموں میں پنہاں ہے۔

مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں، جو تکمیل کے بعد اسلامی دُنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہو گا۔ اقبال نے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی

کی بجائے افلاطونی بے عملی کو اختیار کر لیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ اور حافظ نے ان سے وہ احساس مسرت چھین لیا ہے، جو ''کچھ کر لو'' کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اور اس کی جگہ اس دماغی تفتیش نے لے لی ہے، جو ایک تن بیمار کا خاصہ ہے۔ مسلمانوں میں سنگ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آ گئی ہے۔ خوف خدا کی جگہ مخلوق خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے۔[۱]

مگر زندگی کا ایک نصب العین بنانے سے سب خوف دور ہو جاتے ہیں۔ ترقی و عروج اسلام کے لیے خدا نے ودیعت کر رکھے ہیں۔ پس توحید الٰہی پر کامل اعتقاد ہمیشہ خوف کو زائل کرتا ہے[۲] اور دل میں وہ عزم صمیم پیدا کرتا ہے، جو اخلاق کا طغریٰ ہے۔ حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر[۳] اندروقلس اور شیر کی کہانی[۴] نہیں ہے۔

اسلام کی رُوح مساوات کی رُوح نہیں ہے۔ بانیان سلطنت کا خون بانیان مکانات آب و گل سے زیادہ قیمتی نہیں۔ شریعت کے معتوب کے لیے کوئی پناہ نہیں اور جس کا محافظ قرآن کریم ہے، اسے خوف سے کوئی واسطہ نہیں۔[۵]

اقبال ایک محدود زمانہ کے اندر اسلامی نظام کو از سرِ نو حیات تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعینہٖ جس طرح ایک مہوس مادۂ خام سے سونا نکال لیتا ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا ہے مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے اور موجودہ زمانہ کا نکتہ چیں بھی ہے۔

ایمرسن[۶] افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہملٹ بالکل افلاطونی ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے ہملٹ پن (تشائم پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس تشائم پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس زمین پر رہیں اور یہاں کے ''سرکار'' کی نکوکاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندۂ صبح کی مانند ہے، جو ایک اثیری دنیائے خواب و خیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے، جو بحر حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عمل کا فلسفہ ہے۔

اقبال کو سب سے بڑا اعتراض اس یونانی فلسفی کے مسئلہ عیان[۷] پر ہے، جسے جدید افلاطونیوں نے مرتب کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ پر بدترین ضعف طاری ہے اور وہ ضعف فقدان جذبہ عمل سے ہے۔ ان کا مابعد الطبیعیات قاطع حیات ہے اور مقصد زندگی کا محو کنندہ۔ کیا یہ تباہی کا راستہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسلامی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی معراج نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تحقیق میں زمین پر ایک نائب قائم کرنے والا ہوں۔[۷]

اقبال میں جان ہے، چستی ہے، خلاق ہے، قناعت ہے، تفاؤل ہے، خون تازہ ہے، حقیقت پژوہی

ہے، اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ملت ابراہیمی دار الفنا میں داخل ہو، خواہ اس کا راستہ دکھلانے والا خود افلاطون اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کی فنادگی اور گوسفندی اسے غضبناک کر دیتی ہے۔ وہ اسے رُوحانیت اور تصوف جدید پر محمول کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک مبارز کی حیثیت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مدمقابل کون ہے۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں، وہ حافظ شیراز ہے۔ اقبال کا علم تلوار سے کم کاٹ نہیں کرتا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ یہ رُوحانیت یا تصوف بعد کی پیداوار ہے، اور ہمارے مذہب کی رُوح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اُصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد ''ہمہ اوست'' پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ''ہمہ اوست'' منفی۔ ہارن کا خیال ہے کہ تصوف جدید بہت حد تک زرتشتی اور بدھ مت کے خیالات سے متاثر ہے۔ فان کریمر اس میں ویدانت کے آثار دیکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں صداقت افلاطونیت جدیدہ اور آزادنشو وارتقا کے بین بین ہے۔

تصوف کے رؤیت حق اور افلاطون کے اعیان نامشہود میں مماثلت ہے۔ صوفیوں کا رقص مستانہ در حقیقت نقل ہے۔ فلاطونی رُوح کی جو ایک متحرک دائرہ ہے، اپنے مرکز قدیم کے گرد اور بس۔ اور یہ مرکز خود خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ افلاطونیت جدید اور تصوف جدیدہ دونوں کی تفاصیل اور ظواہر میں بہت حد تک تطابق موجود ہے۔ براؤن لکھتا ہے کہ فلاطینوس[8] کی تحریرات صاحب الفہرست[9] اور شہرستانی[10] سے مخفی نہیں تھیں۔

اسلام ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ خدا ربّ العالمین ہے اور مادّہ کی علت سے مبرا۔ اس کی مخلوق سراب نہیں۔ جس طرح خدا لکڑی اور پتھر سے تراشا نہیں جا سکتا، اسی طرح اس کی رویئت بھی مادّی یا رُوحانی آنکھوں سے ناممکن ہے۔ شیخ احمد سرہندی[11] اپنے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں: ''اگر کوئی صوفی یا مجذوب خیال کرتا ہے کہ اس نے خدا کا دیدار کیا ہے، چشم ظاہر سے یا چشم باطن سے، تو اس نے اپنے واہمہ یا دماغ کی متصور شکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا'' خداوند تعالیٰ بے مثال ہے، یکتا ہے اور نظر سے اوجھل۔ خدا تک پہنچے کا راستہ شریعت کا راستہ[12] جدید تصوف کے خیالات باطلہ ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر کو افلاطون اور ارسطو کے تاثرات سے آزاد کر دے۔ تاثرات جن کا لازمی نتیجہ رہبانیت و تباہی ہے۔ تصوف جدید رہبانیت ہے۔ یہ اس دُنیا کو خواب درخواب مایا یقین کرتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہے۔ اس نے اسلام کی تعلیم عمل کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور عمل ہی اصل اسلام[13] ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو بھی اسی عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔ اس کی حقیقی رُوحانی تعلیم، اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظ سے کیوں برسرِ کار پیکار ہے؟ اور مولانا جلال الدین رومی کے خلاف صف آرا نہیں ہوتا،

حالانکہ موخر الذکر تمام متصوفانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں، تو انھیں قدرتاً الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں، مگر اظہار خیالات زمینی الفاظ ہوں گے۔ عشق جب ''مے'' اور ''نغمہ'' کے پردوں میں بیان کیا جائے گا، تو عجب نہیں اس سے ماڈی اور ہیجانی لذات مراد لی جائیں۔ سنائی، عطار اور رومی باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں، جو ان کی رُوحِ حقیقی کو صاف نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ناظرین کو دُنیا سے پرے لے جائیں۔ مگر وہ اُس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ برخلاف اس کے حافظ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا دیوان بصیرت سے زیادہ سکر آور ہے بے ریب سقراط[۱۴] کی مانند حافظ مخرب اخلاق نہیں، تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں عمدہ معاون ضرور ہوا ہے۔ اس سے بہتوں نے شرابِ حقیقت کی بجائے شرابِ مجازی پی ہے۔ اقبال کا حملہ دراصل اس اپیکورس[۱۵] کے خلاف ہے، نہ کہ شعراء کے ماڈی تصوف جدیدہ پر۔

جیسے کہ نکلسن دیوان شمس تبریز کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

تصوف جدید کے انحطاط کی انتہا ہے کہ اس نے پیر کو الوہیتی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ پیر کے سب وشتم اور بد اخلاقیوں بلکہ اس کے جرائم کی نہ صرف یہ کہ تاویل کی جاتی ہے بلکہ اُن کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔۔۔ ایسے نظریوں کا جو برا اثر سادہ لوحوں پر پڑتا ہے، اس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں'' یہ دوسری وجہ ہے اقبال اور آج کل کے صوفیوں کے درمیان جنگ کی۔ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی، تو بعض صوفی پیر جنھیں روایاتِ باطلہ کی پابندی، اور شریعت حقہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا[۱۶] اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ''اسے دار پر کھینچ دو، یہ مسلمانوں کو مغربی ماڈیت کی تعلیم دیتا ہے۔'' اقبال کی آواز شور و شغب سے بلند سنائی دی۔ ''جاہل اور برخود غلط! خدا کی شان کہ آج افلاطونی اور ہمہ اوستی مجھے مغربی ماڈیت کا شائع کرنے والا خیال کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اہم ترین سوال مسئلہ وطنیت ہے۔ اسلام قیدِ مکانی سے آزاد ہے اور وطنیت بستہ حدود و جہات ہے۔ اقبال بھی اپنے آپ کو اسلام اور وطن کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔ اس کی شاعری ان خیالات کی تصویر ہے، جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں گزر رہی ہیں۔ وہ میکیاولی[۱۷] کو مجرم گردانتا ہے، اور اسے ''مقامی ریاست'' کے خیال کا باقی قرار دیتا ہے۔ اقبال اس فلارنساوی کو موردِ طعن ٹھہراتا ہے، جس نے دُنیا کی اانکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی ''کتاب الملوک'' شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی بلکہ اس لیے کہ اس کی تعلیم دانتے[۱۸] اور مارسلیس کے ''ریاست عالمگیر'' کے خیال کو زائل کرنے اور عیسائیت روما کو حدودِ اطالیہ میں قیام کرنے پر منتج ہوئی۔ اقبال نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی

چہار دیواری میں قید ہو کر لخت لخت ہو جائے۔ اقبال کی سیاست اخوت پر مبنی ہے، نہ کہ خود غرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔ وطن یا ملک ایک عارضی یا جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی حیات عارضی ہوتی ہے۔ اور وہ چند صدیوں کے لیے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی ''ریاست عالمگیر'' مذہبی ہے، خدائی ہے، آدرش ہے، اور ابدی ہے مگر بایں ہمہ اقبال یہ نہیں کہتا ہے حبّ وطن، حبّ الایمان کی نقیض ہے۔ کل مین جزو ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت میں حبّ وطن پوشیدہ ہے۔ اسلامیاب ہند کے رایت پر دو نشان ہیں، اسلامیت محض اور وطنیت اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہیں، اگرچہ راہیں الگ الگ ہیں۔[۱۹]

درحقیقت اقبال میں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبہ حب الوطنی کا امتزاج کامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمح نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔ سیاسی نقطہ خیال اور مذہبی مقصد نظر کے اختلاط نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دے دی ہے۔

فریڈرک نٹشے[۲۰] کے خیال میں فن کی دو شکلیں ہیں: (۱) اپالونی اور (۲) ڈایونیسنی، اپالونی پر وقار اور سنجیدہ تفکر ہے۔ ڈایونیسنی طوفان اور ہیجان کا دوسرا نام ہے۔ نٹشے کا ''ارشادات زرتشت'' جو عہد حاضر کے جرمنی کا شاہکار ہے، بالحاظ ہر دو موضوع اور طرز تحریر ڈایونیسنی ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی بھی جو دونوں اسلام کی حیاۃ ثانیہ کے نشانات ہیں، اسی قبیل سے ہیں۔ کیا اقبال نٹشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ مستعار چیزوں کو جلا دے کر ایک نئی اور عجوبہ چیز بنا دیتا ہے۔ نٹشے میں اس کے ماخذ حکایت ''الماس و زغال'' (اسرارِ خودی) سے دیکھے جا سکتے ہیں، جو تصنیف مندرجہ بالا کی حکایات[۲۱] (پتھر و کوئلہ) سے ماخوذ ہے مگر چونکہ اقبال نٹشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا ہے۔

نٹشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرات سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے:

''میں اسی طرح مرد و عورت کو چاہتا ہوں، ایک جنگ کے قابل اور دوسری امومت کے لائق۔''

نسائیت اقبال کے نزدیک امومت کے ہم معنی ہے۔[۲۲] ''اے لوگو! ڈرو اپنے خدا سے جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا اور تمہارے جوڑے پیدا کیے۔ اور پھر ان دونوں سے کئی مرد اور عورتیں پیدا کیں۔''[۲۳] اور نسائیت کے لیے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ وہ دختر رسولؐ، بتول علیؓ اور ام حسینؓ شہید کربلا ہیں۔ جب شاعری کی آنکھ عورت پر پڑتی ہے، تو وہ اس سے پرے خاتون جنت کو دیکھتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی آنکھیں دن رات اپنی اولاد کو دیکھتی ہیں، اور اسلامی دُنیا پر بارش ضیا و نور کی رہی ہیں۔[۲۴]

عفت وعصمت مستورات وہ بنیادی پتھر ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دیواریں قائم ہیں۔ آج کل کی نام نہاد آزاد عورت جو ایک محدود خاندان میں یقین رکھتی ہے، سلطنت کے زوال اور مذہب کے ادبار کی نشانی ہے۔[۲۵] اقبال نے ایک نہایت اہم سوال کو چھیڑا، مگر اس نوعی بحث کو طول دینے سے احتراز کیا، اور اس کے جملہ پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ بہت لطف ہو، اگر وہ نسائیات کے بعض مسائل کی توضیح کر دیں، مثلاً مرد اور عورت کے لیے غیر مساوی شرائط نکاح یا پھر فقہائے قدیم کے اُصولوں کی کوئی نئی تاویل وتوجیہ پیش کریں۔

اقبال بعض معاملات میں روسو[۲۶] کی مانند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہد نبوی کے شاندار شب وروز آجائیں، اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں۔ روسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اقبال دشت حجاز پر مٹا ہوا ہے، اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تہذیب حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں، جس میں سطحی اور تعیش کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات عربی ہیں، اس لیے انھیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہیے۔ یورپ کی نقل کسی طرح سودمند نہیں ہوسکتی، جیسا کہ ایرانی اوضاع واطوار نے ماضی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لیے مہلک ثابت ہوا۔[۲۷]

لیکن اسلامی سوسائٹی ان پُرانی روایات پر پھر سے کیسے قائم کی جاسکتی ہے۔ ''تاریخ قوم کے لیے وہی کام دیتی ہے، جو حافظہ فرد کے لیے۔'' مسلمانوں کی تمام حیات ماضی، ان کے تمام محسوسات ومزعومات، عزائم اور کامیابیاں، اس دن سے جب ان میں قومی ومذہبی زندگی کا احساس پیدا ہوا، اوراق تاریخ میں غیر فانی طور پر محفوظ ہیں اور تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا چاہیے۔[۲۸] زندگی کو سادہ بناؤ، اس میں جھوٹے تصنع، فرقہ وارانہ خیالات اور غیر مخلصانہ وخودغرضانہ خواہشات کا گزر نہ ہو۔ اخلاقی، دماغی اور سیاسی بزدلی جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت کی جڑیں کاٹ رہی ہے، اسے دور کرو۔

اس کے معنی رجعت قہقہری نہیں۔ مصلح کا کام ماضی سے شاندار عہد کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔ اس سے مراد شادہ اخلاق، زندگی پر ایک مردانہ نظر اور عرب کی شجاعانہ جانبازی کا ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کر کے ان کے دلدر کاٹنا ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کی بزدلی کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکوں۔

جب مثنویوں کا علم کلام ہر جگہ سمجھ میں آجائے، تو تمام اسلامی دُنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے۔ اقبال ایک پیغام بر ہے، وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے۔ مگر وہ مستقبل ایسا ہے جیسے اس کے ہر طرف دھند چھائی ہے، اگرچہ دھند گہری

نہیں ہے۔

بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آخر مثنویوں کو اُردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوگا؟ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو گاہے گاہے ایک پیغام اور ایک مقصد کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دُنیا کے لیے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستاں اور دہلی، کابل، طہران، قاہری، قازان، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا روم کی جگہ استعمال کرنے کے لیے ہیں۔

مثنویاں بحر رمل مسدس مقصود میں لکھی گئی ہیں۔ بحر رمل میں یہ تبدیلی غزل اور مثنوی میں متداول ہے۔ مثنوی معنوی بھی اسی بحر میں لکھی ہوئی ہے۔ پہلی مثنوی (اسرارِ خودی) زیادہ حقیقی ہے، دوسری (رموزِ بے خودی) زیادہ تخیلی ہے۔ رموز میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جاتیں، تو دماغ پر اس کی بھی وہی حقیقی گرفت ہوتی جو اسرار کی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسا نقص نہیں جو مصنف دور نہیں کر سکتا ہے۔

اقبال نے فارسی ادبیات کی جھوٹے مصنوعی ادب القدما سے اصلی ادب القدما کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ صائب کے بعد کے شعرا عہد زریں کا ایک غیر شعوری اور مدھم سی گونج رہ گئے تھے۔ اقبال کا پھر سے اساتذۂ قدیم کی روش اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ بیدل اور اس کے متبعین کی شاعری کے خلاف ہے، جو رنگین پردوں میں لپٹی ہوئی ہے جس میں حسن وکشش تو ہے مگر قوت وعمل نہیں۔ اس کا طرز تحریر مولانا روم کا ہے۔ لیکن الفاظ ایسے ہیں جیسے کسی مرصع تلوار کے دستہ میں موتی جڑے ہوں۔ لیکن باوجود اپنے اس عظیم الشان پیش رو کی تقلید کے اقبال یقیناً بیسویں صدی کی پیداوار ہے، نو بیدار مشرق کی رُوح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور اقبال کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس نے ایرانی شاعری کی وامانده رگوں میں خون تازہ دوڑا دیا ہے۔ اور حسن صوری کے ساتھ قوت معنوی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مثنویوں کی زبان بہت پر شوکت ہے، لیکن اس مردانگی کے باوجود اس میں لوچ اور لچک ہے۔ آج جبکہ فارسی زبان خود اپنے وطن میں اس قدر بدنما ہوگئی ہے، اقبال اس کے شباب کی یاد دلاتا ہے۔ فارسی ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف جب خود ایران میں ادبی انحطاط نمایاں ہے دوسری طرف ایک موسیٰ نے اپنے عصا سے چٹان کو ضرب لگائی ہے اور ایک نیا کوثر پھوٹ بہا ہے، جو بنی اسرائیل کے بارہ چشموں سے کسی طرح کم نہیں۔[۲۹]

(نیرنگ خیال، اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)

❁...❁...❁

حواشی و حوالہ جات

۱- اس مضمون کو علامہ ممدوح نے ''حکایت طائرے کے از تشنگی بے تاب بود'' اور حکایت ''الماس و زغال'' میں بیان فرمایا ہے۔ موخر الذکر میں جب کوئلہ الماس سے پوچھتا ہے کہ باوجودیکہ ہماری پیدائش ایک کان سے ہوئی ہے، کیا وجہ ہے کہ تو سرتاج شہنشاہاں ہوتا ہے اور میں انگیٹھی میں جلتا ہوں۔ تیری قدر ہوتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں:

گفت الماس اے رفیق نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامون خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثل سنگ شد
پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجود خام خویش
سوختی از نرمئ اندام خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش
می شود از روئے عالم مشیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشت خاکے اصل سنگ اسود است
کہ سر از جیب حرم بیروں زدست
البتہ از طور بالا تر شد است
بوسہ گاہ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی نا پختگی است

۲-

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

هر که حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینه او راه نیست
خاطرش مرعوب غیر الله نیست
هر که در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسویٰ قطع نظر
میں نهد ساطور بر حلق پسر
با یکی مثل هجوم لشکر است
جاں بچشم او ز باد ارزاں تر است

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اے که در زندان غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
ایں سبق صدیق را صدیق کرد
سر خوش از پیمانه تحقیق کرد
از رضا مسلم مثال کوکب است
در ره هستی تبسم بر لب است
گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو
قوت ایماں حیات افزایدت
ورد ''لا خوف علیهم'' بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از ''لا تخف'' محکم شود
بیم غیر الله عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رهزن است
بیم جاسوسے است از اقلیم مرگ
اندرونش تیره مثل میم مرگ
هر شر پنهاں که اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست
هر که رمز مصطفیؐ فهمیده است
شرک را در خوف مضمر دیده است

یہی مضمون محاورہ ''تیر و شمشیر'' اور حکایت ''شیر و عالمگیر'' میں بیان کیا گیا ہے۔ آخر الذکر کے دو شعر درج ذیل ہیں:

عشق را آتش زن اندیشہ کن
روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

۳-

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبار دودماں گورگاں
درمیاں کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں
در صف شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از تربتش پیداستے
روزے آن زیبندۂ تاج و سریر
آن سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سر بیشہ اے
با پرستارے وفا اندیشہ اے
سرخوش از کیفیت باد سحر
طائران تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہ رمز آگاہ شد محو نماز
خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز
شیر ببر آمد پدید از طرف دشت
از خروش او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر
دست شہ نادیدہ خنجر برکشید
شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را
شیر قالیں کرد شیر بیشہ را
باز سوئے حق رمید آں ناصبور
بود معراجش نماز با حضور

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینہ مومن وطن
تو ہم اے نادان دلے آور بدست
شاہدے را محملے آور بدست

۴- اندرد قلس اور شیر کی کہانی مشہور ہے:

اندرد قلس روما کا ایک رم خوردہ غلام تھا۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی۔ اچانک اس غار میں ایک شیر بھی داخل ہوا اور بجائے غلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے اپنا پاؤں اس کے سامنے رکھ دیا جس میں کانٹا چبھا تھا۔ غلام نے وہ کانٹا نکال دیا اور شیر چلا گیا بعد میں غلام گرفتار ہوا اور حسب قانون اسے شیر کشتی لڑنے کا حکم ہوا۔ حسن اتفاق کہ اس کے مقابل وہی شیر چھوڑا گیا جس کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ جب شیر اس پر جھپٹ کر آیا تو اسے پہنچانتے ہی فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے پیر چاٹنے لگا۔ جب حکام نے یہ نظارہ دیکھا تو غلام کو آزاد کر دیا۔ ایک اسی طرح کا واقعہ برطانوی سفیر روما سر جارج ڈیوس کا بھی ہے۔ لیکن طوالت سے خالی نہیں۔ اس لیے چھوڑتا ہوں۔

۵- مساوات اسلامی کا مضمون نہایت تفصیل سے رموز کے باب رسالت میں درج ہے۔ میں صرف ''حکایت سلطان مراد و معمار'' سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں:

بود معمارے ز اقلیم خجند
در فن تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد
مسجدے از حکم سلطان مراد
کوش نیامد شاہ را تعمیر او
خشمگیں گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید
دست آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعد معمار رفت
پیش قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنر مندے کہ دستش سنگ سفت
داستاں جور سلطان باز گفت
قاضی عادل بدنداں خستہ لب
کرد شہ را در خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآں پرید
پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام
اعتراف از جرم خود آوردہ ام

گفت قاضی فی القصاص آمد حیواۃ
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند
آیۂ بالعدل و الاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰ بخشیدمش
یافت مورے برسلیمانے ظفر
سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسند دیبا یکے ست

۶- رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳ء-۱۸۸۲ء) امریکہ کا مشہور مصنف، انیسویں صدی کے اخلاقیات پر اس کی تصنیفات اور تعلیم نے نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا فلسفہ خود اعتمادی و خود داری اور اس کا رُوح کے احکام کی پابندی پر زور دینا بہت مؤثر ثابت ہوا ہے اور حال اس کے خیالات کا دائرہ اثر ترقی پذیر ہے۔

۷-

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرماں رواست
جام او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است
حکم او برجان صوفی محکم است
عقل خود را بر سر گردوں رساند
عالم اسباب را افسانہ کواند
کار او تحلیل اجزائے حیات
قطع شاخ سرد رعنائے حیات
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت

حکمت او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفتہ و معدوم بود
منکر ہنگامہ موجود گشت
خالق اعیان نامشہود گشت
زندہ جاں را عالم امکاں خوش است
مردہ دل را عالم اعیان خوش است
آہوش بے بہرہ از لطف خرام
لذت رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش
از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

۸- واذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خليفة (البقرہ-۳۰)

۹- بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افلاطون، اس کے فلسفہ اور فلاطینوس اور افلاطونیت جدیدہ (اشراق) کی نسبت کچھ تھوڑا سا لکھ دیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ مضمون میں اکثر استعمال ہوئے ہیں:

(الف) افلاطون (۴۲۹-۳۴۷ ق م) وہ سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کا اصلی نام ارسطاقلس تھا۔ مگر اس کے چوڑے چکلے سینے کی وجہ سے سقراط نے اس کا نام افلاطون رکھا۔ اس نے فلسفہ کو تین شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ اخلاقیات، منطق (ما بعد الطبیعیات) اور الہیات۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کو اپنی شکل پر بنانے کا خیال کیا۔ اس نے پہلے رُوح کو بنایا جو محسوس اور معقول کے درمیان توصل کا کام دیتی ہے۔ اس رُوح کے ساتھ اس نے جسد خاکی کو ملایا۔ رُوح جسم کے تین حصوں میں رہتی ہے۔ دماغ، دل اور انتڑیاں، اور ان سے بالترتیب عقل، جوصلہ اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدائی کی طرح مادّہ کو بھی ازلی مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام علم اپنی انتہا میں واحد اور آزاد ہے۔ خدا تمام چیزوں کا معیار ہے۔ اور اس میں ہی ہمت اور عقل کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور قدرت میں جو کچھ اصلی ہے اور جو خیالات وقوانین کا مجموعہ ہے خدا سے نکلا ہے۔ اس کا مسئلہ اعیان نامشہود مشہور ہے۔ اس کی کتاب ''الجمہوریت'' اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور اس کے نصب العین سیاسیات کو واضح کرتی ہے۔

(ب) فلاطینوس (۲۰۳ یا ۲۰۴ میں پیدا ہوا اور ۲۶۲ اور ۲۷۰ کے درمیان فوت ہوا) نے افلاطونیت جدیدہ کو مرتب کیا۔ اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا۔ مگر اس کے خیالات اپنے پیشرو سے کچھ اس قدر مختلف ہیں کہ افلاطون سے اس کی نسبت بھی غلطی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ کی قدر و قیمت اس کے خیالات کی وجہ سے نہیں بلکہ بوجہ اپنی تاریخی اہمیت اور بعض انسانی طبائع کے تجزیہ کی وجہ سے ہے۔ افلاطون کے نزدیک عقل میں جو کچھ بہترین اور اعلیٰ ترین ہے،

اس کا نام خیر ہے۔ فلاطینوس خیر کو تجرید محض خیال کرتا ہے۔ افلاطون انسانی اخلاق کی معراج عقل انسانی کے ذریعہ تتبع خداوندی قرار دیتا ہے۔ فلاطینوس تتبع اور خود صفات اللہ کو بنگاہ حقارت دیکھتا ہے اور انسانی مطمح نظر ادغام بر الہ یقین کرتا ہے۔ فلاطینوس کے نظریہ کے مطابق رُوح اپنے مبداء سے ایسے ہی نکلی ہے جیسے سورج سے شعاعیں، اور اب غیر ارادی طور پر اپنے منبع کو دیکھنے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے۔ اس حرکت میں اس سے تصور اور تصور سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ خیال انسانی رُوح کا آفرینندہ ہے۔ مادّہ خیر کا زیریں ترین مقام ہے اور اسی کی ارتقائی حالت خیر ہے۔ وہ انسان اور خدا کے درمیان بلا واسطہ تعلق کا قائل ہے۔

۱۰- ابوالندیم۔

۱۱- ابوالفتح محمد الشہرستانی۔ مصنف کتاب الملل والنحل جس میں مختلف سنی فرقوں کا حال بالتفصیل درج ہے۔ کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ سال وفات ۱۱۵۳ء مطابق ۵۴۸ھ۔

۱۲- شیخ احمد سرہندی کا لقب مجدد الف ثانی ہے۔ شیخ عبدالوحید فاروقی سرہندی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند ۱۵۶۳ء مطابق ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے مشہور ولی اللہ خواجہ باقی اللہ کے مرید تھے۔ ان کا یقین تھا کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک شخص ایسا پیدا ہوتا ہے، وہ تمام علوم اسلامیہ میں کامل اور طاقت وشوکت اسلام کا بڑھانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ دوسرے ہزار سال کا مجدد میں ہوں۔ ۱۶۲۴ء مطابق ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ مقبرہ سرہند میں ہے۔

۱۳-

در شریعت معنی دیگر مجو
غیر ضو در باطن گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں
پختہ تر از دے مقامات یقیں
ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام
با تو گویم سر اسلام است شرع
شرع آغاز است وہ انجام است شرع
شارع آئین شناس خوب و زشت
بہر تو ایں نسخہ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت
جانے کوبے در جہاں اندازدت

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دین مصطفیٰ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آن سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دل آہن رباید زنگ را

۱۴- فلسفۂ عمل علامہ کا بڑا دل پسند موضوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کی تعلیم دی ہے، اور ہر جگہ نئے انداز سے دی ہے۔ اگر جگہ تنگ نہ ہوتی تو دوسری کتب سے حوالہ جات پیش کرتا مگر:

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

صرف اسرار و رموز ہی پر اکتفا کرتا ہوں، اور وہ بھی صرف ایک جگہ سے۔ ضرورت ہے کہ ناظرین کتاب کو خود نگاہ غائر مطالعہ کریں:

اے ز جور چرخ ناہنجار و تنگ
جام تو فریادی بیدار سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو
شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہان نا مساعد ساختن
ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار
روزگار تو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست
آزماید صاحب قلب سلیم
زور خود را از مہمات عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
حربہ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیدا ستے
اصل او از ذوق استیلا ستے
عفو بیجا سردی خون حیات
سکتہ اے در بیت موزدن حیات
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

۱۵- سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) یونانی فلسفی۔ افلاطون کا اُستاد۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنے نفس کو جانو یعنی اپنی انا کا اندازہ کرو۔ رُوح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے، ہماری وہ چیز جو علم بھی رکھتی ہے اور بے علمی بھی، خیر بھی اور شر بھی۔ اپنی خدا پرستی کی وجہ سے زہر سے ہلاک ہوا۔

۱۶- اپیکرس (۳۴۲-۲۷۰ ق م) یونانی فلسفی۔ اس کی تعلیم کا اُصول یہ تھا کہ چونکہ خوشی اور غم ہی دُنیا کے خیر و شر ہیں لہٰذا فلسفہ کا مقصد اولیٰ حصول مسرت اور انعدام کلفت ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک سکون قلب مبنی بہ مراقبہ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اس کی تعلیم ''کھاؤ پیو اور خوش رہو'' ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔

۱۷- حضرت علامہ نے ایک جگہ ایسے پیروں کی نہایت صحیح شکل کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتہ تسبیح از زنار ساخت
پیر ہا پیر از بیاض مو شدند
سخرہ بہر کودکان کو شدند
دل ز نقش لا الہ بیگانہ اے
از صنمہائے ہوس بت خانہ اے
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ زیں سوداگران دیں فروش

با مریداں روز و شب اندر سفر
از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند
سینہ ہا از دولت دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصف پرست
اعتبار ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بتخانہ دوخت
مفتی دین مبیں فتویٰ فروخت
''چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رخ سوئے مے خانہ دارد پیر ما''

۱۸- میکیاولی (۱۴۶۹ء-۱۵۲۷ء) اطالوی مورخ وسیاس۔ وہ فلارنس میں پیدا ہوا۔ اور وہاں مدتوں ریاست میں مناصب جلیلہ پر سرفراز رہا۔ آخر معطل کیا گیا اور اپنے جاگیری بندوبست میں بقیہ عمر بسر کی۔ اس کی ''کتاب الملوک'' سب سے پہلے ۱۵۳۲ء میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کی اجازت سے شائع ہوئی۔ اس میں اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان ایک حد فاصل قائم کی۔ اور اس میں زمانہ حال کے کئی سیاسین نے اس کی تقلید کی ہے، وجو اپنی سیاسی اغراض و مقاصد میں اُصول اخلاق کو دخل نہیں دیتے۔ حضرت علامہ اس کی نسبت سے فرماتے ہیں:

دہریت چوں جامہ مذہب درید
مرسلے از حجرت شیطاں رسید
آں فلارنساوی باطل پرست
سرمہ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ اے بہر شہنشاہاں نوشت
در گل ما دانہ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت
حق ز تیغ خامہ او لخت لخت
بت گری مانند آزر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد
نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گرویدہ است

طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت
ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشم اہل عالم چیدہ است
مصلحت تزدیر را نامیدہ است

۱۹- دانتے (۱۲۶۵ء-۱۳۲۱ء) اٹلی کا بزرگ ترین شاعر ہے۔ اس کی ڈیوائن کو میڈی (طربیہ الٰہی) مشہور و معروف ہے۔ اس میں مصنف نے طبقات علوی کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ اسے اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دوزخ، دارالکفارۃ اور جنت۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ میں ایک گھنے جنگل میں جانکلا ہوں، جہاں ورجل (اس سے پہلے کا ایک اطالوی شاعر) کا ہیولا ظاہر ہوتا ہے اور دوزخ اور دارالکفارۃ میں اس کی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دوزخ کے جو نظارے دانتے نے بیان کیے ہیں، بلحاظ وقت نظر، اعتقاد تامہ اور جزئیات کرداری نگاری غالباً بے نظیر ہے اور شاید کسی ایک مصنف کے کلام میں اتنی خوبیاں بیک وقت نہیں ملیں گی۔ دارلکفارۃ میں نظارنے تقریباً وہی ہیں البتہ سزا و عقوبت عارضی ہے۔

جنت سماوی میں اس کا رہبر اس کی معشوقہ بطریس ہے۔ سات طبقوں کی سیر کے بعد وہ آٹھویں طبقہ میں پہنچتا ہے۔ جہاں حضرت یسوع مسیح کو اپنے صاحب عظمت حواریوں کے حلقہ میں دیکھتا ہے۔ نویں طبقہ میں وہ اپنے آپ کو رُوح کل کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔ اور ارواح مرحومہ کو ایک لامحدود دائرہ میں تختوں پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ خود دسویں طبقہ میں، جسے وہ وفور نور کے باعث نظارہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام رؤیائی تجربات کی بنیاد دراصل اعتقاد حسن، خیر و زشت، شر اور محبت کی عالمگیری اور قدرت عظیمہ ہے۔ اور یہ سب کچھ اس جوش و خروش اور صحت کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ الہام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مدتوں اس کے ہم وطنوں کا یہ خیال رہا کہ یہ تمام حالات الہامی ہیں۔

۲۰-

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را در خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل باقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند
می نہ گنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دل او یاوہ گردد شام و روم
عقدۂ قومیت مسلم کشود

از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دین
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین
آں کہ در قرآں خدا او را ستود
آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو
از فریب عصر نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہبر و ہشیار باش

۲۱- فریڈرک نٹشے (۱۸۴۴-۱۹۵۰ء) جرمن شاعر اور فلسفی۔ لیکن چونکہ وہ اصل میں شاعر تھا، اس لیے اس کے نزدیک فلسفہ بھی ندگی اور فکر کی تنقید ہی ہے۔ اس کے خیال میں تمام مخلوق میں جس میں انسان بھی شامل ہے، آرزوئے حیات سب سے زیادہ ہے، جس کے معنی کہ طاقت حاسل کی جائے اور تمام رکاوٹوں کا قلع قمع کیا جائے جو زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔ موجودہ انسان مخلوق خداوندی کا منتہائے مقصود نہیں، بلکہ جیسے جانور کی ارتقائی صورت انسان ہے، ایسے ہی انسان بھی عارضی ہے۔ اور اس کے بعد مکمل انسان (فوق البشر) ہوگا، جس میں حسن و طاقت، عقل و اخلاق، قوت ارادی و عمیق نگاہ بدرجہ کمال ہوں گے۔ اور ان الفاظ کے معنی بھی ان کے موجودہ مطلب سے کچھ زیادہ وسیع ہوں گے۔ محبت، رحم اور ہمدردی اس کے لیے بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کے نزدیک فطرت ان الفاظ سے مبرا ہے اور مندرجہ بالا مقصود کی طرف بغیر دائیں بائیں دیکھے جاری ہے۔

اس طرح گویا اس نے انتہا درجہ کی انفرادیت کی تعلیم دی جس میں زندگی کی نسبت مقصد حیات گنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اشتراکیت اور فوضویت، مساوات سیاسی اور حکومت عوام کالانعام کے سخت خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنوں کی موجودہ ذہنیت کے لیے بہت حد تک وہ ذمہ دار ہے اور گزشتہ جنگ عظیم کی تہہ میں اسی کی تعلیم تھی۔

۲۲-

نغمہ خیز از زخمہ زن ساز مرد
از نیاز او دو بالا ناز مرد
پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است
آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر اور فرد با طیب و الصلوٰۃ
نیک اگر بینی امومت رحمت است
زانکہ او را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما
در خط سیمائے او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرف امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس
ورنہ کار زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما

۲۳- یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا و بث منھما رجالًا کثیراً و نساء۔(نساءآیت۱)

۲۴-

سیرت فرزند ہا از امہات
جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرے خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامان نماز
اشک او بر چید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں
رشتہ آئین حق زنجیر پاست
پاس فرمان جناب مصطفیٰ است

اسی سلسلہ میں ''خطاب بہ مخدرات اسلام'' بھی زیر نظر رہی۔

۲۵-

آں تہی آغوش نازک پیکرے
خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطن او نازن است
بند ہائے ملت بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار اموت بر نتاخت
بر سر شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستان ما نارستہ بہ
داغش از دامان ملت شستہ بہ

۲۶- روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸ء) ایک عجیب انقلابی دل ودماغ کا مالک تھا۔ فرانس میں جب حکومت نے اس کو جلاوطن کیا تو انگلستان پہنچا۔ یہاں بھی ہوا راس نہ آئی، تو واپس فرانس آیا تو عمر تصنیف وتالیف میں گزار دی۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی ابتدائی فطرتی حالت بہترین تھی۔ اس میں عجیب طور پر سرگرم جذبہ محبت و رافت کے ساتھ ساتھ تمام قائم شدہ اُصول وقواعد کے خلاف سخت مخالفانہ و جارحانہ خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے لیے وہ بھی بہت حد تک ذمہ دار گردانا گیا ہے۔

۲۷-

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بیں عمل را راہبر است
چوں درخش برق پیش از تندر است

فکر صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدہ ای
نوبہار ہند و ایراں دیدہ ای
اند کے از گرمی صحرا بخور
بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بہر گرمش بدہ
تن دمے با صرصر گرمش بدہ

مگر رموز میں اس سے اور بھی صاف اور واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقا از دست رفت
آں نہال سر بلند و اُستوار
مسلم صحرائی اشتر سوار
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند
گشت از پامال مورے درد مند
آنکہ حزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد
کوشش او با قناعت ساز کرد
تا بہ کشکول گدائی ناز کرد
شیخ احمد سیّد گردوں جناب
کاسب نور از ضمیرش آفتاب
گل کہ می پوشد مزار پاک او
لا الہ گویاں دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر
از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حد دین نبی بیروں گذشت
اے برادر ایں نصیحت گوش کن
پند آں آقائے ملت گوش کن

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی

۲۸-

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصہ پارینہ ؟
ایں ترا از خویشتن آ گہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند
رُوح را سرمایہ تاب است ایں
جسم ملت را چو اعصاب است ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جہانت می زند
شمع او بخت امم را کوکب است
روشن از وے امشب و ہم دیشب است
چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضی تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
موج ادراک تسلسل زندگی است
مے کشاں را شور قلقل زندگی است

۲۹- واذ استسقیٰ موسیٰ لقومہ فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا قد علم کل الناس مشربھم (البقرہ ۶۰)